مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک معمار ملّت

سید محمد رابع حسنی ندوی ☆

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ، دامت برکاتہم ،
سیمینار میں شریک نہ ہو سکے ، البتہ ان کا مضمون مل
گیا تھا ، جو شکریئے کے ساتھ شامل کیا جا رہا ہے ۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی علمی و عملی شخصیت بننے کے آغاز میں ہی تاریخ اسلام کی مجددانہ خصوصیات رکھنے والی شخصیتوں کا اور ان کے کاموں کا مطالعہ کرلیا تھا ، وہ اس بات سے علمی طور پر واقف ہو گئے تھے کہ کن حالات میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت ملی اور اس خلافت سے انہوں نے کیا انقلابی کام لیا اور کن حالات سے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ گزرے ، اور کس عزیمت اور صبر و ثبات کا انہوں نے ثبوت دیا ، امام غزالیؒ ، امام ابن تیمیہؒ ، امام ابن قیمؒ ، عبدالرحمٰن بن الجوزیؒ اور اس کے بعد کے دور میں برصغیر کے دائرہ میں رہتے ہوئے جو پانچویں ۔ چھٹی صدی ہجری سے چودھویں صدی ہجری تک پھیلا ہوا دور ہے ، شیخ خواجہ معین الدین چشتیؒ ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ ، حضرت مجدد الف ثانی ، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ جیسی متنوع کمالات رکھنے والی شخصیتیں اور اپنے اپنے دور کے حالات اور تقاضوں کے مطابق اپنے اپنے طرز پر انقلابی جدوجہد کی مثالیں مولانا کے مطالعہ میں آئیں ، اور مولانا کو اپنے اس مطالعہ کے دوران ایسے اساتذہ اور مرشدین کی سرپرستی ملی جنہوں نے مولانا کے اس دوران پیدا ہونے والے شعور میں مہمیز کا کام دیا ۔ اس طرح کے مطالعہ کا شوق دلانے میں مولاناؒ کے برادرِ معظم مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کا بنیادی کام حصہ آیا ، مولانا کا یہی مطالعہ تھا ، جس نے مولانا میں وسیع اور متنوع پہلوؤں کے حامل

☆ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ و صدر رابطہ ادب اسلامی برصغیر و ممالک شرقیہ ۔

اصلاح امت کے کام کو خصوصی اہمیت والا کام بنا دیا۔

جس کے تقاضہ سے مولاناؒ نے پہلا تصنیفی کام سیرت سید احمد شہیدؒ کی صورت میں انجام دیا، جس کو برصغیر کے باشعور مسلم طبقہ نے اہمیت دی اور بہت سراہا، اور اس امت کی خصوصی رہنمائی کرنے کی ضرورت کی طرف ایک اہم توجہ دہانی کا ذریعہ سمجھا اور بعض باشعور اور بیدار طبیعت علماء نے مولانا کے سامنے یہ بات رکھی کہ اس کے تقاضہ سے کچھ کرنے کی بھی فکر کرنی چاہیے، یہ بات مولانا کے بعد کے ایک دیرینہ رفیق فکر وعمل مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ کی طرف سے آئی اور اس کے نتیجہ میں دونوں حضرات نے پورے برصغیر کا ایک دورہ کیا جس میں مختلف جگہوں پر مختلف شخصیتوں کے کام اور پیغام کا جائزہ لیا، اس میں تحریکات کے زعماء اور اہل باطن علماء شامل تھے اور دونوں حضرات نے بعض تحریکات سے اچھی توقع قائم کی اور ان سے تعلق پیدا کیا اور بعد میں حسب ضرورت اپنے رویہ میں تبدیلی کی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم کا منہج ندوۃ العلماء کا منہج تھا، جس میں فقہی اختلاف کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی جو فقہی مسلک کے اعتبار سے شدت پسند حلقوں میں دی جاتی ہے، اور تاریخ کے وسیع مطالعہ کی بنا پر امت کی ضرورت کو بہت وسیع دائرہ میں دیکھا جاتا ہے، چنانچہ مولانا کا ذہن صرف برصغیر تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ بلاد عربیہ اور بلاد عجمیہ تک وسیع ہوا۔ مولانا کے برادر معظم اسی رجحان کے تھے، اور وہ برصغیر کے مسلمانوں کی ملی ضروتوں کو سمجھنے اور اس کی فکر رکھنے کے ساتھ برصغیر کے باہر کے مسلمانوں کے حالات سے بھی واقفیت رکھنے کی فکر کرتے تھے، اس میں وہ صرف برصغیر تک اپنی فکر کو محدود رکھنا صحیح نہیں سمجھتے تھے، شمالی افریقہ، وسط ایشیا اور خود مرکز اسلام جزیرۃ العرب جو مسلمانوں کی تاریخی عظمت کے عظیم گہوارے ہیں ان سے دلچسپی رکھنے میں :من لم یهتم بامرنا و بامور المسلمین فلیس منا ، کے تقاضہ کو سامنے رکھتے تھے۔ ان کو اس کی فکر ہوتی تھی کہ نیپال میں مسلمانوں کا یہ حال ہے، حرمین شریفین کو کس طرح کے خطرات کا اندیشہ ہے، مراکش اور طرابلس میں فرانس اور اٹلی کے کیا مظالم ہیں؟ افریقہ کے مسلم ممالک میں کس طرح کی دشواریاں اور پریشانیاں ہیں؟ برطانیہ کی استعماری چیرہ دستیاں دین وملت کو کن کن ملکوں میں نقصان پہنچا رہی ہیں؟ یہ وہ احساسات اور تقاضے تھے

جوحضرت مولاناؒ کو اپنے بھائی، اپنے خاندانی ماحول، اپنے بعض مرشدوں اور اساتذہ سے ملے، چنانچہ انہی احساسات نے مولانا سے ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین ''(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) نامی وہ عظیم کتاب لکھوائی جس میں تاریخ اسلام کا اصلاحی اور تہذیبی جائزہ پیش کیا کہ اس امت نے دنیا کی قیادت کے کام سے آغاز کیا اور اپنی ذمہ داریوں کو بطریقہ احسن صدیوں انجام دیا، لیکن پھر کئی صدیوں کے بعد اپنے جادۂ حق پر مضبوطی قائم رکھنے میں کوتاہی شروع کردی جس کے نتیجہ میں وہ غیروں کے مقابلہ میں آگے رہنے کے بعد پیچھے ہوتی چلی گئی، چنانچہ دنیا کی سربراہی غیروں میں چلی گئی، پھر غیروں کو جب قیادت ملی تو انہوں نے بے انصافی سے کام لیا، مولاناؒ نے اس کا جائزہ لینے کے بعد واضح کیا کہ اب اس امت کے لیے بقاء وعزت کی ضمانت کس طرز عمل اور طریقہ کار میں ہے؟ ایسی کتاب لکھنے کے لیے اپنوں اور غیروں دونوں کے حالات سے گہری واقفیت کی ضرورت تھی اور غیروں کے حالات انہی کی زبان وبیان کے ذریعہ جاننے کی ضرورت تھی، نیز صرف حال نہیں، بلکہ ماضی کا غائر نظر سے جائزہ لینے کی ضرورت تھی، مولاناؒ کو رائج الوقت عصری زبان اور عربی زبان کے قدیم وجدید اسالیب سے گہری واقفیت حاصل ہونے کی وجہ سے اس کام میں وہ دشواری پیش نہیں آئی جو ان لوگوں کو پیش آئی ہے، جو زبان اور اسلوب زبان کے معاملہ میں وہ مہارت نہیں حاصل کرسکے جو مولاناؒ کو حاصل تھی، چنانچہ کتاب کو پورے عالم اسلام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی، اور لوگوں کو مسلمانوں کے عروج وزوال کے معاملہ میں جو الجھن پیش آتی تھی وہ الجھن دور ہوئی، اور آگے بڑھنے اور اپنے آپ کو اپنے صحیح مقام پر لانے کے سلسلہ میں قابل عمل راہ اختیار کرنے میں رہنمائی ملی۔ مولاناؒ نے یہ کتاب عربی میں لکھنے کے وقت تک برصغیر کے باہر کا کوئی سفر نہیں کیا تھا، اس کتاب کی تیاری کے اختتامی مرحلہ میں ہی انہیں حج کی سعادت حاصل ہوئی اور وہاں پورے عالم اسلام کی متعدد اور مختلف اہم شخصیتوں سے ملاقات ہوئی اور تبادلہ خیال کا موقع ملا اور اس کے بعد ہی کتاب منظر عام پر آگئی۔ کئی سال بعد پھر مولاناؒ کو سفر حج کا موقع ملا، جس سے فراغت پر مولانا نے عالم عرب کا دورہ کیا، اس دورہ کی تحریک اور ہمت افزائی ان کے برادر معظم کی طرف سے پہلے ہی سے تھی، جو مولاناؒ کے لئے تقویت کا باعث رہی،

اس میں مولاناؒ نے مصر، سوڈان اور شام میں کچھ کچھ مدت گذاری۔ وہاں کی خدمت ملت اور نصرت دین سے وابستہ اہم شخصیات سے ملاقاتیں کیں۔ حجاز میں موجود شخصیتوں سے پہلے ہی ملاقاتیں ہو چکی تھیں، مولاناؒ کا یہ دورہ خاص طور پر اس زمانہ میں ہوا جب شمالی افریقہ اور وسط ایشیا میں مغربی استعمار کا مقابلہ کرنے اور ان سے ٹکر لینے والی تحریکوں اور کوششوں کے وہ زعماء جو اپنے ملکوں سے باہر نکال دیئے گئے تھے، ان کو عام طور پر مصر میں پناہ حاصل ہوئی تھی، ایسی اکثر اہم شخصیتوں سے مولاناؒ کی ملاقات مصر کے سفر میں ہوئی اور ان سے معلومات بھی حاصل ہوئیں، اور تأثرات، نصرت حق کے تجربات اور رجحانات بھی معلوم ہوئے، اور خود مولاناؒ کا تعارف ان کی عظیم کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کے ذریعہ ان شخصیتوں کو حاصل ہو چکا تھا، اس لیے ملت کے لیے درد اور اس کی مصلحتوں کی فکر میں توارد اور احساس ضرورت میں یکسانیت پیدا ہوئی اور یہی مولاناؒ کے دورہ کا زمانہ بھی تھا کہ دورہ کے اختتام پر صرف چند سالوں میں ان میں سے اکثر ممالک میں وہاں کی حکومتوں کی استعماری طاقتوں کے سامنے خود سپردگی اور اس کی وجہ سے وہاں کے عوام میں بے چینی اور بددلی اس درجہ تک پہنچ گئی تھی کہ جگہ جگہ فوجی انقلاب ہونے لگے، جن کا اعلیٰ مقصد اصلاح حکومت تھا، لیکن ان کا عمل بتدریج مزید فساد اور بگاڑ سامنے آیا اور وہ پریشان کن حالات جو فوجی حکومتوں کے جبر سے ظہور میں آرہے تھے مولانا کے مطالعہ میں آئے۔ اسی دوران مولانا کا ترکی کا سفر بھی ہوا اور وہاں تقریباً چالیس سال سے جو مذہب دشمنی وہاں کی فوجی حکومت کی وجہ سے جاری تھی اس کے افسوسناک حالات کا مشاہدہ مولاناؒ نے اپنی آنکھوں سے کیا۔ ان سب باتوں نے مولاناؒ میں پورے عالم اسلام کے حالات سے مزید بے چینی پیدا کر دی، اور اسی کے نتیجہ میں مولانا کی وہ کتاب (الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ)، اسلامی ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش) منظر عام پر آئی جس میں اسلامی نقطہ نظر اور مغرب کے استعماری نقطہ نظر کے ٹکراؤ سے جو مصیبت عالم اسلام کو عمومی طور پر پیش آرہی ہے اس کا جائزہ پیش کیا گیا، اور اصولاً یہ بتایا گیا کہ مغرب نے مشرق پر محض علم اور علمی وعملی وسائل کے بھرپور استعمال کے ذریعہ سے یہ برتری حاصل کی جس کی وجہ سے وہ مسلمانوں کو اہل حق ہونے کے باوجود اپنے غلبہ کا اور اسی غلبہ کی بنا پر

ظلم و جور کا نشانہ بنا رہا ہے اور مسلمانوں کو اس کوتاہی کی گویا سزا دے رہا ہے جو کوتاہی انہوں نے ایمان وعمل صالح کے ساتھ علمی وعملی وسائل کے حصول اور ان کے صحیح استعمال میں کی۔

مولاناؒ کی پوری فکر ان دو کتابوں سے کھلے طریقے سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اصلاح حال اور بہتر صورت حال اختیار کرنے کے لئے تاریخ کے وہ واقعات اور وہ کوششیں جو مسلمانوں کے لئے اصلاح حال اور اپنے منصب زعامت پر آنے کے لیے نمونہ کا کام دے سکتی ہیں ان کو بھی مولانا نے بیان کرنا اور اہل دانش کے سامنے رکھنا ضروری سمجھا اور اس کے لیے مولانا کی نئی تصنیف ''تاریخ دعوت وعزیمت'' تیار ہو کر سامنے آئی۔

مولانا کے مذکورہ بالا حالات وصفات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولاناؒ کو اس امت کی فکر کتنی زیادہ تھی، اور کتنے وسیع پیمانہ پر تھی۔ اس کے ثبوت میں مولاناؒ کا خود اپنا شخصی علم بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ وہ اصحاب اقتدار کو خواہ اپنے ملک کے ہوں یا کسی دوسرے مسلمان ملک کے ہوں، خدمت ملک وقوم کی طرف خوش اسلوبی اور حکیمانہ انداز میں متوجہ کرنے کی ضرورت سمجھتے تو اس کے لئے ان سے ملاقاتیں کرتے تھے، اور ان کو خطوط لکھتے تھے حسب موقع پبلک جلسوں میں بھی اپنا خیال ظاہر کرتے تھے اور غلط رخ پر لے جانے والی قیادتوں پر تنقید کرتے تھے۔ مولاناؒ کے یہ خیالات بعض وقت ان لوگوں کو بالکل سمجھ میں نہیں آتے تھے جن کا مطالعہ عالم اسلام کے سلسلہ میں صحیح اور جامع نہیں ہوتا تھا، ان میں سے بعض وہ زعماء جو ملک میں بڑا اثر رکھتے تھے اس طرز عمل کی حقیقت سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے مولاناؒ کے ان خیالات کی مخالفت کرتے، لیکن اس کے باوجود مولاناؒ اپنی بات کہتے، حالانکہ اس وقت ممالک اسلامیہ کے یہ قابل تنقید حالات ایسے کھلے ہوئے نہ تھے کہ جن کو سب محسوس کر سکیں، لیکن بتدریج ان حالات کے نتائج کے سامنے آنے پر دنیا نے محسوس کیا کہ مولاناؒ نے ان حالات کے آغاز پر جو کہا تھا وہی صحیح تھا۔ مولاناؒ نے ترکی کے سفر سے واپسی پر مصطفیٰ کمال اتاترک پر سخت تنقید کی تھی اور اس کو اسلام دشمنی کا سخت مرتکب قرار دیا تھا۔ اس وقت تک ہندوستان کے مسلم زعماء اور علماء مصطفیٰ کمال کو ان کی خدمت ملک وقوم کے ابتدائی کردار کی بنیاد پر برابر غازی کمال پاشا سمجھتے رہے تھے، وہ سخت متعجب اور ناراض ہوئے کہ ایک غازی کو مولاناؒ نے دشمن اسلام قرار دیدیا۔ اسی طرح مولاناؒ نے مصر سے واپسی پر

اخوان المسلمین کی دینی حمیت اور اسلامی جذبہ کی تعریف کی اور یہ اس وقت کی بات ہے کہ مصر کے فوجی قائد جمال عبدالناصر اور اخوان میں ٹکراؤ شروع ہوگیا تھا، مولاناؒ نے اخوان کو قریب سے دیکھا اور ان کے فکر وعمل کو قریب سے سمجھا تھا، لہذا مولاناؒ نے اسی کے مطابق اظہار رائے کیا۔ اس وقت ہندوستان کے مسلم زعماء وعلماء بڑے چراغ پا ہوئے، مولاناؒ نے اس کی بالکل پروانہ کی، بلکہ جمال عبدالناصر کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی اور امت مسلمہ کے لیے ان کے نقصانات دہ رجحانات کی نشاندہی کی اور مخالفت کی، کیونکہ وہ اپنے آغاز حکومت کے موقف سے بدل گئے تھے۔ مولاناؒ کی اس بات نے ہندوستان کے زعماء وعلماء ملت کو ناگواری اور ناپسندیدگی میں مبتلا کیا، لیکن بعد کے نتائج نے یہ ثابت کیا کہ اخوان المسلمین کے ساتھ ان کی حکومت کا جو رویہ تھا وہ صحیح نہ تھا، بلکہ ظالمانہ اور غیر اسلامی تھا۔ اس کے برعکس اخوان کی جو دینی اور اخلاقی زندگی تھی وہ بہت معیاری اور اسلامی تھی اور ان کے مقابلہ میں فوجی قائد کی سختی اور زبردستی انسانیت سوز حد تک پہونچ گئی تھی اور اس کے خیالات کے نتیجہ میں مصر اور پورا عالم عربی دینی حمیت کے جذبات سے عاری ہوکر کمیونسٹوں کے ملحدانہ جذبات کی طرف جانے لگا تھا اور یہی سب حال شام کے انقلاب کے بعد وہاں بھی سامنے آیا کہ اصلاح کے لئے جو فوجی انقلاب ہوا وہ اسلام سے ایک منحرف فرقہ، دروزی فرقہ کے غلبہ والا اور اس کی حکومت لانے والا انقلاب ثابت ہوا، جس سے اسلام پسندوں کو بڑی مشکلات سے گذرنا پڑا پھر عراق میں جو فوجی انقلاب ہوا جس کے نتیجہ میں صدام حسین اور ان کے پیشرو احمد حسن البکر برسر اقتدار رہے، ان سے عراق کے عوام کو اپنی اسلامیت کے تحفظ میں اور خود اپنی جمہوری آزادی میں جو شدید کلفت پیش آئی اور ظلم وسفاکی کا سامنا کرنا پڑا، اب وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ رہی۔ حضرت مولاناؒ نے اپنی کتاب میں ان سب باتوں کو اسلام اور مغربیت کی کشمکش کے ہی مظاہر قرار دیا اور اس مغربیت کا مقابلہ کرنے اور ملک وقوم کو صحیح راہ عمل پر لانے کی طرف توجہ دلائی ہے اور صرف کتاب ہی میں نہیں بلکہ جن مسلمان سربراہوں سے ملاقاتوں کا موقع ملا ان کو بھی انہیں باتوں کی طرف توجہ دلائی ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولاناؒ کا اصلاح امت کا نقطۂ نظر کتنا دردمندانہ، علمی وعملی لحاظ سے مدلل اور کس قدر آفاقی اور جامعیت رکھنے والا تھا اس کی مثال عموماً دوسرے اہل قلم

واہل فکر اور مصلحین امت میں کم ہی ملتی ہے اور ان کو جہاں مولاناؒ کی ان دو کتابوں سے سمجھا جا سکتا ہے وہاں اس کی وضاحت مولاناؒ کے سفرناموں میں بھی ملتی ہے، جو مصر، سوڈان اور شام کے سلسلہ میں مذکرات سائح فی الشرق العربی (شرق اوسط کی ڈائری) اور ترکی کے سلسلہ میں (دو ہفتے ترکی میں) اور مراکش کے سلسلہ میں ''مغرب اقصی مراکش میں.....'' اور افغانستان، ایران، لبنان اور اردن کے سلسلہ میں ''دریائے کابل سے دریائے یرموک تک''، اسی طرح جزیرۃ العرب کے سلسلہ میں ''بین العالم وجزیرہ العرب'' اور سعودی بادشاہوں کے نام خطوط کے مجموعہ میں نظر آئے گا۔

مولاناؒ کے دورے یورپ اور امریکہ کے ملکوں کے بھی ہوئے، ان کے سلسلہ میں مولاناؒ کے خیالات اور مشورے مولاناؒ کی تقریروں اور تحریروں میں آئے جو ''مغرب سے صاف صاف باتیں'' اور ''نئی دنیا امریکہ میں.....'' میں دیکھے جا سکتے ہیں، اس کے علاوہ راقم کی کتاب ''دو مہینے امریکہ میں'' میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، جو گویا مولاناؒ ہی کے دورۂ امریکہ کی سرگذشت ہے۔

بلاد عربیہ میں نئے اور استعماری طاقتوں کی ہمنوائی کرنے والے نظریات میں سب سے خطرناک اور اہم نظریہ جو اوپر سے بھلا معلوم ہوتا ہے، لیکن اندر سے زہر رکھنے والا ہے، وہ قومیت کا نظریہ ہے، جس کا آغاز شام کے ایک عیسائی مغرب پسند شخص نے جس کا نام میشیل مفلق تھا شروع کیا کہ عربوں کی ساری خوبیاں اور عظمت ان کے عربی النسل ہونے کی وجہ سے ہیں، اور عربوں کو دراصل اپنی عربی قومیت پر فخر کرنا اور اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو خواہ سیاسی ہوں یا ثقافتی اسی کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔ یہ دعوت اور تحریک اس وقت زیادہ خطرناک بن گئی جب اس کو جمال عبدالناصر جیسے بااثر لیڈر اور رفوجی ڈکٹیٹر نے اختیار کر لیا، اس کے نتیجہ میں پورا عالم عربی نظریاتی اور عملی دونوں طریقوں سے ایسے نقطۂ نظر کی طرف منتقل ہونے لگا جس میں اسلام کو زندگی کے ایک چھوٹے سے کونہ میں جگہ مل رہی تھی، وہ عرب جن کی ساری عظمت اور جاودانی کا مقام اسلام سے حاصل ہوا وہ اپنی اسی بنیادی خصوصیت سے محروم کر دیئے جائیں، تاریخ میں دنیا کی کتنی قومیں ہیں جنہوں نے اپنے کو اپنی نسل یا لسانی دائرہ میں محدود کر کے اپنے کو

اسی طرح کی بیشمار قوموں کی طرح تاریخ کے کباڑ خانہ میں منتقل کر دیا۔ عربوں کو بھی اس نقطۂ نظر کے نتیجہ میں اسی نقصان میں مبتلا کر دیا جائے، اس کا سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اسلام سے ان کے تعلق کا جو امتیاز اور مقام بلند ہے، وہ ختم ہو جاتا ہے اور اس طریقہ سے گویا ان میں اسلام کو بھی ختم کرنے کی یہ ایک تدبیر کی گئی، چنانچہ مولانا نے اس کی سخت مخالفت کی، اور یہ کہا کہ میں نسلاً عرب ہوں لیکن عرب قومیت کو اسلام کے ساتھ دشمنی سمجھتا ہوں اور کوئی بھی ایسی عصبیت جو نسلی یا لسانی بنیاد پر ہو وہ تفرقہ کا باعث اور انسانیت کی قدروں کو پامال کرنے والی ہے، چنانچہ مولانا نے اس پر بڑا سخت مضمون لکھا، اس کا عنوان تھا: ''اسمعوها منی صریحة أیها العرب !!'' کہ اے عربو! مجھ سے صاف صاف یہ بات سنو۔

مولانا کے اس اعلان اور اظہار کو وہ عرب جنہوں نے عرب قومیت کے نظریہ کو صرف اوپر اوپر سے دیکھا تھا ناپسند کیا، لیکن جب اس کے مضر اثرات ظاہر ہونا شروع ہوئے تو انہوں نے مولانا کو داد دی، اور مولانا کے کہنے کو پسند کیا، مولانا برابر اسی کی دعوت دیتے رہے ہیں، چنانچہ جب بنگلہ دیش میں زبان کے تعصب کو کھلے طریقہ سے اپنایا گیا اور اس کے نتیجہ میں بہاری اور بنگالی کے ٹکراؤ کے حالات سامنے آئے تو وہاں بھی مولانا نے لسانی عصبیت کو سخت مضر قرار دیتے ہوئے اس کو انسانیت کے خلاف نظریہ قرار دیا، جس پر ان کا رسالہ ''لسانی عصبیت کا المیہ'' مشتمل ہے۔

بہر حال مولانا نے کھلے طریقہ سے تقریروں اور تحریروں میں مغربیت کی اسلام دشمنی اور لسانی عصبیت کی مضرت رسانی کی مخالفت کو اپنا موضوع بنایا، اور اس کو امت اسلامیہ کے لیے بہت خطرناک ظاہر کیا، اور اسلامی اخوت اور صحیح اسلامی قدروں اور تسلحوا باء سلحة اعدائکم'' اور '' واعدوا لهم ما استطعتم من قوة '' کے تحت عزت اور قوت کے جو جو قابل اختیار وسائل ہیں ان کے اختیار کرنے کی دعوت دی، مولانا کے یہ خیالات اور اسکے لیے ان کی ممکنہ کوششیں مولانا کی اکثر تصنیفات میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

مغربیت کا خطرناک پہلو مولانا کی نظر میں صرف اس کا سیاسی پہلو ہی نہیں تھا، اس کے سیاسی پہلو کو وہ ایک ذریعہ کی حیثیت دیتے تھے۔ ان کے نزدیک اس کی اصل خطرناکی مذہب

بیزاری تھی، یورپ میں گزشتہ صدیوں میں جو مذہب سے بغاوت تھی اس نے مذہب اور سیاست کو الگ الگ خانون میں بانٹ دیا تھا سیاست کے دائرہ میں ثقافت اور اخلاق کو رکھا تھا، اور مذہب کے خانہ میں گرجا کے اندر جا کر کیے جانے والے عمل کو رکھا تھا، اس طرح انسانی زندگی کو مذہب سے علیحدہ کرلیا اور یہ بات بیزاری کے قائم مقام ہے، چنانچہ یورپ کی قوموں کی زندگی میں مذہب صرف گرجا تک محدود ہے، لیکن اسلام میں مذہب زندگی کے ہر پہلو سے تعلق رکھتا ہے، چونکہ اسلام میں مذہب زندگی کو خدا اور رسول کے حکم اور پسند کے مطابق گذارنے کو کہتے ہیں اور اس طرح مذہب زندگی کے ہر پہلو سے کسی نہ کسی حد تک وابستگی رکھتا ہے، اس کو کسی بھی شعبہء زندگی سے الگ نہیں کیا جاسکتا، اور یہ بات اسلام میں پوری طرح قابل عمل ہے، مذہب کے سلسلہ میں جو احکامات دیئے گئے ہیں وہ انسان کی ضرورت اور دشواری اور فطری تقاضے اور ناقابل برداشت صورت حال اور ناگزیر باتوں کی بڑی رعایت رکھتے ہیں، اور اسلام ایسی کسی بات سے نہیں روکتا جو انسان کے لئے عملی طور پر ناگزیر ہو، یا اس کے فطری فائدہ کا حامل ہو، اسلام کی اس خصوصیت کی بنا پر مذہب پر عمل زندگی کے کسی مرحلہ میں مشکل نہیں ہے، اسلام میں جن باتوں پر پابندی لگائی گئی ہے وہ انسانی معاشرہ اور انسانی فرد کے تحفظ کے لئے اور انسانی قدروں کی بقاء کے لئے ضروری ہے، لہذا کوئی ایسا نظریہ جو مذہب کو زندگی سے بے دخل کرتا ہو کسی بھی مذہب کے لئے قابل قبول ہوسکتا ہے، لیکن اسلام کے ماننے والوں کے لئے بالکل قابل قبول نہیں ہے، وہ مسلمان سے صرف اسلام ہی کو سلب نہیں کرتا، بلکہ اس کی انسانی قدروں کو بھی سلب کرلیتا ہے، مولاناؒ نے اسی لئے مغربیت کے اس مضر پہلو کو کہ وہ مذہب کو زندگی سے علیحدہ کرتا ہے، بہت خطرناک اور مضر قرار دیا اور اس کے خلاف برابر مضامین اور اپنے خطبات میں اظہار خیال کیا، اور چونکہ مغربیت کا یہ پہلو مغربی تعلیم کی وجہ سے خاصا عام ہونے لگا تھا اس لئے مولاناؒ نے اس کے خلاف مزید شدت اختیار کی۔

مولاناؒ نے اپنی بعض تقریروں میں یہاں تک کہا کہ حالات ایسے ہوتے جارہے ہیں کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے مقبروں میں کتنے ایسے آدمی دفن ہوتے ہیں جن کی تحقیق کی جائے تو وہ مسلمان کے دائرہ میں نہیں آتے کہ جب اسلام کی بنیادی قدروں پر ہی آدمی کو ایمان نہ

ہوتو تنہا نام مسلمان رکھ لینے یا تنہا مسلمان گھر میں پیدا ہو جانے سے کیسے وہ اللہ کے یہاں مسلمان ہو جائے گا؟ اس لئے سخت ضرورت ہے کہ ہمیں اس بات کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور اپنے کو صحیح مسلمان بنانے کی فکر کرنی چاہیے، اس کے لیے مولاناؒ نے جو اہم ترین مضمون لکھا ہے وہ ''نیا طوفان اور اس کا مقابلہ'' کے عنوان سے شائع ہوا اور پھر مولاناؒ کی اس توجہ دہانی کے نتیجہ میں یہ طے ہوا کہ اس موضوع پر مضمون لکھے جائیں، اور کوشش کی جائے، یہ مرض جدید تعلیم یافتہ طبقے میں زیادہ پیدا ہو رہا ہے، اس لئے اس کی خاطر ذہن سازی کی کوشش کی جائے، اسی کے لیے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کو بحیثیت علمی اکیڈمی کے قائم کیا گیا، جس نے مولاناؒ کے اس نقطہ نظر کے مطابق رسائل وکتب شائع کرنے شروع کیے، جن کی تعداد مولاناؒ کی زندگی میں ہی دوسو سے اوپر ہوگئی تھی اور اس کے ذریعہ اردو، عربی، انگریزی اور ہندی میں مفید لٹریچر شائع کئے، جس کا اچھا حصہ خود اکیڈمی کے زیرنگرانی تیار کرایا گیا، مولانا کو اس اکیڈمی کی بڑی فکر رہتی تھی اور اس کے ذریعہ کام کیے جانے کو بڑی اہمیت دیتے تھے، اور مولاناؒ اپنے ان خیالات اور تنصیبات کو دیگر زبانوں میں بھی منتقل کرانے کی فکر کرتے تھے، چنانچہ مولاناؒ کی فکر کی شہرت اور ان کے کام کی اہمیت جیسے جیسے وسیع مراکز میں محسوس کی جاتی رہی ان کی کتابیں دوسری بیرونی زبانوں میں بھی منتقل ہوتی چلی گئیں، چنانچہ مولاناؒ کا لٹریچر ترکی زبان میں اور دنیا کی دیگر زبانوں میں خاصی تعداد میں منتقل ہوا۔

☆.....☆